۸ مئی ۱۹۷۱ء

ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۲۹ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | شمارہ ۱۸

اس شمارے میں

آل احمد سرور

اردو تحریک ــــ ایک ذاتی جائزہ

(۲)

پچھلی اشاعت میں ہم نے عرض کیا تھا کہ اردو کی بقا اور ترقی اردو والوں کی اپنی صلاحیت سے وابستہ ہے اور اس کے لئے اول خود کوشش کرنا ہے، دوسرے اکثریت کے معقول طبقے کو اپنا ہم نوا بنانا ہے، تیسرے تقسیم کار کے اصول پر عمل کر کے، اپنے ذوق، وسائل اور نقطۂ نظر کے مطابق اردو کی بقا کا کوئی پہلو اپنے لئے مخصوص کر لینا اور ساتھ ساتھ دوسرے اداروں اور اشخاص سے جو کوئی دوسرا پہلو لیں، تعاون کرنا ہے۔ جہاں تک اپنی کوشش کا سوال ہے، ہمیں تسلیم ہے کہ موجودہ حالات میں انفرادی یا اجتماعی کوششیں بھی ایک جمہوری سماج کے نظام کے حدود کو دیکھ کر ہی متعین کی جا سکتی ہیں اور بعض اوقات برسوں کی پرخلوص کوششیں، سماجی اتھل پتھل یا شر پسند عناصر کی معمولی سی حرکت سے مجروح ہو جاتی ہیں۔ پھر بھی یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ ہر پرخلوص کوشش جس کے پیچھے ایک قومی نقطۂ نظر ہے اور جو کسی تہذیبی یا لسانی نقش کو مستحکم کرنا چاہتی ہے، اپنا گہرا اثر ضرور چھوڑتی ہے۔ کام کبھی کبھی رک جاتا ہے، مگر پھر چلنے لگتا ہے، لوگ مخالفت کرتے ہیں، مگر پھر ساتھ ہو جاتے ہیں اور مدد کرتے ہیں۔ جیسے جیسے کام کی خوبی ظاہر ہوتی ہے، لوگ ساتھ آتے جاتے ہیں اور کارواں بنتا رہتا ہے، ہاں اس میں وقت لگتا ہے اور عقیدے کی گرمی اور عمل کی پختگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے اردو دوستوں کو بہر حال ایسی تعمیری کوششیں جاری رکھنی ہیں۔ اپنے علاقے میں ابتدائی یا ثانوی تعلیم کا انتظام کرنا، اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی ایک جماعت بنانا، وسائل مہیا کرنا، ایسے لوگ تیار کرنا جو کام کی اہمیت کو سمجھیں اور اس کا حق ادا کریں محض اسے اپنی شہرت یا ناموری کا زینہ نہ بنائیں۔ پھر اس کے لئے اپنے سیاسی نقطۂ نظر سے اختلاف رکھنے والوں کو بھی ساتھ لینا پڑتا ہے کیونکہ سیاست خصوصاً آجکل کی الیکشن اور جھگڑے کی سیاست وقتی اور فوری مقاصد رکھتی ہے اور تعلیم کا کام جو دراصل حقیقی سیاست کا کام ہے، دور اور آگے دیکھنے اور دور تک دیکھنے کا نام ہے۔ غرض اردو دوستوں کو سب سے زیادہ توجہ ایسی ہی تعمیری کوششوں پر صرف کرنا ہے۔ سوال ان کا ہے، دوسروں کو کیا پڑی ہے کہ وہ ان کے مسئلے کی خاطر اور ان کے مفاد کے لئے جان کھپائیں اور خون جگر صرف کریں۔ پھر معاملہ صرف ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا ہی نہیں ہے، اچھی کتابوں، اچھے رسالوں، اچھے اخباروں کی اشاعت کا بھی ہے۔ ریڈنگ روم اور کتب خانے قائم کرنے کا بھی ہے۔ زندگی کے کاروبار میں اردو کے لئے جگہ نکالنے کا بھی ہے خواہ دفتروں میں اس کے چلن کا سوال ہو یا کسی عدالت میں اردو میں عرضی دینے کا، یا دفتروں اور سڑکوں پر اردو میں بھی ہدایات لکھے جانے کا۔ ان سارے کاموں پر توجہ ہو سکتی ہے اور ہونی چاہئے۔ ان میں مخالفت کا بھی سامنا ہوگا، اچھے تنگ نظر حلقوں سے فرقہ واریت کا الزام بھی لگے گا، مگر یہ سب تو برداشت

کرنا ہے اور اپنا کام جاری رکھنا ہے۔ پھر چونکہ آج کل اقتصادی حالات پر بہت کچھ منحصر ہوتا ہے اس لئے اردو کو روزگار اور تجارت میں جگہ دلانی ہے، آج بھی کچھ لوگ اس سے روزی کماتے ہیں، مگر ان کا مقصد موجودہ دور کی دلچسپیوں سے کام لے کر اپنا مطلب نکالنا ہے چٹ پٹے افسانے، سلگتی ہوئی نظمیں، مزیدار خاکے، کچھ فلمی ستاروں کی باتیں، کچھ وزیروں یا افسروں کی مدح، ان باتوں پر چراغ پا ہونے کی ضرورت نہیں ایسا ہوتا رہے گا۔ لیکن موجودہ دور کی دلچسپیوں سے کام لے کر بھی اردو کی خدمت ہو سکتی ہے، ادبی ڈائجسٹ اس کا ایک ثبوت ہیں۔

دوسرا کام اتنا آسان نہیں، مگر اتنا ہی ضروری ہے، ہندوستان میں اردو بولنے والے ایک لسانی اقلیت ہیں یہ اقلیت ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں سبھی پر مشتمل ہے، مگر اس میں بڑی تعداد مسلمانوں کی ہے اردو ایک جدید ہندوستانی زبان ہے اور اس کی ترقی میں ہندوستان کے تمام مذہبی فرقوں نے حصہ لیا ہے، مگر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ اردو ہندوستان کے مسلمانوں کی تہذیبی زبان بھی ہے اور اس لحاظ سے بھی ایک قومی نقطۂ نظر سے اس کی ترقی ضروری ہے کیونکہ ہندوستان کے مسلمان بھی ہندوستانی قومیت کا ایک اہم جزو ہیں۔ مگر چونکہ ہندوستان میں متعدد بڑی زبانیں اور متعدد اور اہم زبانیں ہیں اور بولیوں کی تعداد تو بہت ہے، اس لئے دوسری زبانوں کے بولنے والوں کی تائید حاصل کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ ایک زبان کے بولنے والے اگر کسی جگہ اکثریت میں ہیں تو دوسری جگہ اقلیت میں بھی ہیں، اس لئے وہ اردو بولنے والی اقلیت کے دکھ درد کو سمجھ سکتے ہیں۔ ان کو قومی نقطۂ نظر سے اردو کی حمایت کے لئے ساتھ لیا جا سکتا ہے یہ بات رفتہ رفتہ ہو بھی رہی ہے، مگر ابھی اسے اور واضح اور موثر ہونا ہے، دوسری زبانوں کے بولنے والوں کو ساتھ لینے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اردو دوست ان کے مسائل میں بھی دلچسپی لیں۔ یوں بھی اردو دوستوں کو صرف اردو کی لڑائی نہیں لڑنی ہے، ہر جگہ تہذیب اور انسانیت، جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم کی آواز میں آواز ملانی ہے اردو دوستوں کا یہ فرض ہے کہ ہندوستان کے ان گنت مسائل میں گہری دلچسپی لیں۔ اس کی ترقی کے ہر منصوبے میں دل و جان سے شریک ہوں۔ اسے کمزور کرنے کی ہر کوشش کی مخالفت کریں۔ اپنے حق کے لئے لڑیں، مگر اس طرح جس طرح گھر والے جھگڑتے ہیں، اردو کے معاملے میں برابر جھگڑتے ہوئے قومی فلاح کے کاموں میں دوسروں کے دوش بدوش کام کریں ملک کی سالمیت کی حفاظت کریں۔ ہر طرح کے بیرونی خطروں کا مقابلہ کریں، ملک کے مفاد کو ہر حال میں پیش نظر رکھیں۔ اگر کبھی اردو کے معاملے میں ناکامی کا بھی منہ دیکھنا پڑے تو روٹھ کر الگ نہ ہو جائیں بلکہ اپنی کوشش جاری رکھیں، اردو کی بقا اور ترقی ملک میں جمہوریت سیکولرزم اور سوشلزم کے فروغ سے وابستہ ہے، یہ نہیں تو اردو کا بھی فروغ نہیں، یہ ہے تو اردو دشواریوں اور مخالفتوں کے باوجود ترقی کرتی رہے گی۔

تیسری چیز یہ ہے کہ ہم تقسیم کار کے اصول کو پہچانیں۔ ہر شخص یا ادارہ سب کچھ نہیں کر سکتا۔ کام کی تقسیم ضروری ہے یہاں یہ سب بحث فضول ہے کہ کون کام اہم ہے اور کون اہم نہیں، اردو کی ترقی کے لئے کوئی سیدھا سادا چند نکاتی پروگرام نہیں بنایا جا سکتا اس کے بہت سے نکات ہیں۔ نہ ایک دن یا ایک سال یا دس سال میں اردو کی بقا اور ترقی کے لئے جدوجہد ختم ہو سکتی ہے نہ ایک دن یا ایک سال یا دس سال میں اردو کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ اردو زندہ تھی اور زندہ رہے گی، اب یہ اردو والوں کا کام ہے کہ وہ اسے کیسی زندگی بخشتے ہیں۔ اردو دوستوں کو جاگیردارانہ دور کی بہت سی عادتوں کو ترک کرنا ہوگا، سرمایہ دارانہ دور کی مقابلے کی اسپرٹ اور محنت کو اپنانا ہوگا، اشتراکی ملکوں سے تہذیب اور ادب کی اہمیت کا احساس سیکھنا ہوگا۔ گویا جدید دور کی زندگی اور اس کی کشمکش کے لئے اپنے کو تیار کرنا ہوگا، جدید حقیقت کو اپنانا ہوگا۔ اردو کے ہر رنگ اور ہر اسلوب کو عزیز رکھنا ہوگا۔ مختلف علاقوں میں لہجے، تلفظ، مقامی محاورے کے لئے دل میں جگہ پیدا کرنی ہوگی۔ روایت کے احساس کے ساتھ تجربات کے لئے ذہن کو کشادہ رکھنا ہوگا۔ اردو تہذیب کو بھی دلی اور لکھنؤ کے گلی کوچوں کے علاوہ ہندوستان کی وسعتوں میں دیکھنا اور دکھانا ہوگا۔ غزل کی لے پر وجد کرنے کے ساتھ آزاد نظم کے رمز کو بھی سمجھنا ہوگا۔ انگریزی کے علاوہ ہندی اور دوسری ہندوستانی زبانوں سے بہت کچھ لینا ہوگا اور بہت کچھ انہیں دینا ہوگا، مگر زبان اور رسم الخط کے لئے ایک اٹل عقیدہ بھی پیدا کرنا ہوگا، اردو کا حق اسی طرح ادا ہو سکتا ہے۔

استفسار

کیا کوئی صاحب ذوق عنایت فرما کر بتائیں گے کہ اردو زبان میں بھی رگ وید کا ترجمہ کسی نے شائع کیا ہے۔ اگر کسی نے کیا ہے تو وہ بزرگ کون ہیں اور اردو کا وہ ترجمہ کہاں سے مل سکتا ہے؟

مسرت جہاں   دلی

رحم علی الہاشمی

سید جالب دہلوی

نوٹ: ہماری زبان کی فرمائش پر رحم علی الہاشمی نے ان ممتاز ادبی شخصیتوں کے متعلق اپنے تاثرات لکھے ہیں جن سے اُن کا کسی نہ کسی حیثیت سے خصوصی تعلق رہا ہے۔ یہ سلسلہ سید جالب دہلوی کی یاد سے شروع کیا جاتا ہے۔

(ادارہ ہماری زبان)

سید جالب دہلوی سے میری سب سے پہلی ملاقات ۱۹۱۶ء میں ہوئی جب راجہ صاحب محمود آباد نے لکھنؤ سے اردو روزنامہ ہمدم جاری کیا اور سید جالب اس کے ایڈیٹر مقرر ہو کر لکھنؤ آئے میں اس وقت کالج میں پڑھتا تھا اور سید صاحب سے ملاقات چلتے پھرتے ہوئے بازار میں ہوئی تھی مگر اسی پہلی ملاقات میں انھوں نے اخبار کے لئے مضمون لکھنے کی فرمائش کر دی۔ چنانچہ پہلے تو میں نے اپنی دو تین نظمیں چھپنے کے لئے دیں اور پھر مضامین لکھ کر دینے لگا۔ اس سلسلہ میں دلچسپ بات یہ ہے کہ میرا سب سے پہلا مضمون حسن فروشی کے متعلق تھا۔ لکھنؤ میونسپلٹی نے یہ تجویز پاس کی تھی کہ طوائفوں کو شہر سے ہٹا کر شہر کے باہر بسایا جائے میں نے اس کی مخالفت کی اور لکھا کہ شہر میں لوگ ان کے اڈوں پر جاتے ہوئے تھوڑا بہت حجاب محسوس کرتے ہیں اور شہر کے باہر یہ حجاب ختم ہو جائے گا اور جہاں یہ آباد کی جائیں گی وہ صرف حسن فروشی کا اڈہ نہ ہوگا بلکہ ہر قسم کے جرائم کا اڈہ بن جائے گا۔ سید جالب نے اس مضمون کو بہت پسند کیا اور اسے دو قسطوں میں بطور ایڈیٹوریل شائع کیا اور اس کے چند دن بعد مجھے بطور پارٹ ٹائم اسسٹنٹ کے اخبار کے عملے میں رکھ لیا چنانچہ میں ایک گھنٹہ صبح کالج سے پہلے اور ایک گھنٹہ شام کو کالج کے بعد دفتر جاتا تھا۔ میرے ساتھ انیس احمد عباسی بھی پارٹ ٹائم اسسٹنٹ تھے اس لئے کہ وہ بھی کرسچین کالج میں پڑھتے تھے۔ عملہ میں ایک اور صاحب یعقوب خاں تھے جو ترجمہ میں مشاق تھے اور ان کو انگریزی اخبارات کے مضامین خاص ترجمہ کے لئے دئے جاتے تھے اور کچھ خبروں کا بھی ترجمہ کرتے تھے۔

سید جالب صاحب اپنے مقالات زیادہ تر اخباروں کے ریپر یا ردی کاغذ پر لکھا کرتے تھے اور چونکہ یہ کاغذ چکنا نہیں ہوتا تھا اس لئے اکثر کاتبوں کو اشتباہ ہو جاتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ انھوں نے اپنے مضمون میں لکھا کہ میونسپلٹی سے نمک فراہم کیا جائے لیکن کاغذ رف ہونے کی وجہ سے نمک کے تینوں حرف الگ الگ ہو گئے اور نون کا شوشہ چھوٹا ہو کر بالکل نقطہ کی طرح ہو گیا چنانچہ کاتب نے معلوم نہیں قصداً یا سہواً اسے ذکر پڑھا لیکن جالب صاحب چونکہ اپنے عملہ پر سخت گیری کے عادی نہ تھے اس لئے اسے ہنس کر ٹال دیا۔

اہل عملہ میں سے اگر کسی کا مضمون انھیں خاص طور پر پسند آتا تھا تو دوسرے دن سب کے سامنے اس کی تعریف کرتے تھے جس سے لکھنے والے کی ہمت افزائی ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ میں نے امرتسر سے واپس آکر اکال تخت ایجی ٹیشن پر مضمون لکھا تو دوسرے دن انھوں نے بہت کھل کر اس کی تعریف کی۔ لیکن اعمال کی تذکیر و تانیث پر مجھ سے ان سے ہمیشہ اختلاف رہتا تھا وہ کہتے تھے کہ سانس ہوا لکھا کرو اور میں ہمیشہ سانس ہوئی لکھتا تھا۔ آخر میں جب کئی مرتبہ انھوں نے کہا تو میں نے کہہ دیا کہ میرے قلم سے ہمیشہ سانس ہوئی نکلے گی لیکن بطور ایڈیٹر کے انھیں اختیار ہے کہ وہ اسے کاٹ کر سانس ہوا بنا دیا کریں چنانچہ اس کے بعد سے

سلیمان اطہر جاوید

سروری صاحب

آج ماحول کا دم سے کہ گھٹا جاتا ہے
بعض حالات کی ڈوبی سی چلی ہے گویا
تیرہ و تار فضا
چار سو جیسے اندھیروں کا تسلط قائم
آج ہر ایک کی پھول ہے حرف ماتم
بس خلا سا ہے جہاں تک بھی نظر جاتی ہے
مٹ گیا جیسے ہر اک چیز کا دنیا سے وجود
یا مری آنکھ سے بینائی نے رخصت مانگی
آج تنقید ادب، علم زباں اور تحقیق
میں وہ الفاظ جو شرمندہ معنی ہی نہیں
میرے بک شیلف کی قیمتی ہیں کتابیں ساری
جیسے الفاظ سے محروم ہوئی ہوں یکسر
ریگزاروں کی طرح
نہ کہیں کوئی نخیل اور نہ کہیں چشمۂ آب
کیا ہے تا حدِ نظر؟ صرف سراب اور سراب،
کوئی نکتہ بھی دکھائی نہیں دیتا مجھ کو
آج ہر صفحہ کسی سادہ صفر کی مانند!
ایک لاشہ، کہ کفن میں ملبوس!
ارضِ کشمیر بتلا ہو تو تیرا
کیا خبر تجھ کو کہ اک گوہر شہوار گیا
ایک تہذیب کا دلدادہ و دلدار گیا
ایک سخن فہم گیا، ایک طرحدار گیا
قافلہ نوحہ بلب، قافلہ سالار گیا

انھوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا اور خود ہی اصلاح کر دیا کرتے تھے۔

سید جالب صاحب کا حافظہ اتنا اچھا تھا کہ اودھ کے تمام بڑے خاندانوں کے حالات ان کے ذہن میں محفوظ تھے جس کا وہ اپنے مقالات میں ذکر کرتے رہتے تھے اور حضرت آدم سے لے کر پچاس سال اس طرف کی ساری تاریخ انھیں ازبر تھی جس کی وجہ سے ان کے مقالات کی تمہید اکثر بہت طویل ہوتی تھی۔ آجکل اس طرز کے لکھنے والوں میں اخبار دعوت دہلی کے ایڈیٹر کو خاص امتیاز حاصل ہے۔

وہ عموماً شام کو سیر کے لئے بازار میں نکلتے تھے شیروانی کے نیچے کے بٹن کھلے ہوتے تھے اور کندھے پر ایک رنگین رومال ہوتا تھا اور ان کی یہ ہیئت بازار کی ایک نمایاں خصوصیت ہوگئی تھی۔

ایک مرتبہ سید جالب صاحب نے اپنے گھر پر چند شاعروں کو مدعو کیا جن میں سراج اور تقدیر کے ساتھ میں بھی تھا۔ جب سب شاعر اپنا اپنا کلام سنا چکے تو سید جالب صاحب سے اصرار کیا گیا کہ وہ بھی اپنا کلام سنائیں چنانچہ بہت اصرار کے بعد انھوں نے اپنا یہ شعر پڑھا ؎

ذرا چل کے جالب کو بھی آزماو

سنا ہے بڑا پارسا ہو رہا ہے

اس پر سراج اور تقدیر نے باہر نکل کر بڑا مذاق اڑایا اور اسی بحر میں بیسیوں فحش شعر کہہ ڈالے۔

سید جالب صاحب کو پرانی کتابیں خریدنے کا بڑا شوق تھا اور ہر اتوار کو پرانی کتابیں خریدنے کے لئے ان کا نخاس جانا ناغہ نہیں ہوتا اور اس طرح انھوں نے بہت اچھی لائبریری جمع کر لی تھی جو افسوس ہے کہ ان کے صاحبزادے کی ناقدری سے ردی میں بکی۔

سید جالب صاحب ہمدم میں آنے سے پہلے کئی ممتاز اخباروں کے ایڈیٹر رہ چکے تھے اور خاص کر پیسہ اخبار لاہور میں کافی دن کام کیا تھا اور اپنی زندگی میں انھوں نے کئی ممتاز جرنلسٹ بنائے جن میں دیوان سنگھ مفتوں اور انیس احمد عباسی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جرنلزم میں سید جالب صاحب کا نام بہت بلند تھا اور پنڈت موتی لال نہرو جیسے ممتاز قومی لیڈر ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ پنڈت جی نے لکھنؤ میں ایک تقریر کی جس کی رپورٹ سب انگریزی اور اردو اخبارات میں شائع ہوئی لیکن پنڈت جی کو سید جالب کی رپورٹ سب سے زیادہ پسند آئی اور اسی کو وہ مستند رپورٹ سمجھے اور کہتے رہے۔

ہمدم سے استعفی دینے کے بعد سید جالب صاحب نے لکھنؤ ہی سے ہمت نام کا روزانہ اخبار نکالا اور اگرچہ میں نے ہمدم کی ادارت سنبھالنے سے پہلے ان کی اجازت لے لی تھی اور انھوں نے فرمایا تھا کہ تم سے بہتر کوئی میرا جانشین نہیں ہو سکتا مگر نئے اخبار کو آگے بڑھانے کے لئے پرانے اخباروں سے نوک جھوک ضروری تھی اس لئے وہ مراسلات کے ذیل میں ہمدم پر چھینٹے ڈالتے رہتے تھے میں نے ایک مرتبہ ان سب کا نہایت متانت سے جواب دیا تو انھوں نے ناراض ہو کر

ہمارے گلی میں مہرباں کیسے کیسے

کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا جس میں ہمدم کو بہت برا بھلا کہا گیا میں نے اس کے جواب میں

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

کے عنوان سے مقالہ لکھا جس میں ہمت کے سارے اعتراضات کا جواب دیا اور تقدیر نے کچھ ہمت کی بھی برائی کی۔ یہ بحث کچھ اور آگے بڑھتی مگر مہاراجہ صاحب محمود آباد نے مجھے بلا کر کہا کہ یہ مناسب نہیں ہے چنانچہ میں نے اپنی طرف سے اس سلسلہ کو ختم کر دیا۔

آخر عمر میں سید جالب صاحب ایک بہت ہی خراب قسم کے مرض میں مبتلا ہوگئے جس میں اس قدر شدید تعفن تھا کہ کوئی ان کے قریب نہیں بیٹھ سکتا تھا اور افسوس ہے کہ ایسے ممتاز جرنلسٹ کی اہل لکھنؤ نے کوئی قدر نہ کی اور ان کے جنازے کے ساتھ میں آدمی بھی مٹی دینے کے لئے نہ گئے۔

سید جالب کو اخبار کے متعلق ہر نشیب و فراز کا اتنا تجربہ تھا کہ وہ جانتے تھے کہ اخبار کے لئے کون زمانہ فراغ بالی کا ہوتا ہے اور کون کساد بازاری کا چنانچہ ستمبر کے مہینہ میں جب زمینداروں کی آمدنی کم ہو جاتی تھی اور خرچ بڑھ جاتا تھا تو وہ اخبار کے خرچ کے لئے پیسے نہیں بچا سکتے تھے اور چونکہ اخبار کے خریدار زیادہ تر زمیندار ہوتے تھے اس لئے ستمبر میں اخبار کی آمدنی بہت کم ہو جاتی تھی اور سید جالب ستمبر کے مہینہ کو ستمگر کہا کرتے تھے۔



ویریندر پرشاد سکسینہ

ناشاد کانپوری کی یاد میں

شری دھر پرشاد کانپوری سے میری سب سے پہلی ملاقات آج سے بیس سال قبل حضرت جگر بریلوی کے دولتکدہ پر بریلی میں محلہ گوندنی چوک بھوڑ میں ہوئی تھی۔ ناشاد صاحب اس وقت بریلی میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر مامور تھے پہلی ہی ملاقات میں میں ان سے متاثر ہوا تھا اس روز جدید اردو شاعری کے سلسلے میں ناشاد صاحب نے جگر صاحب سے تبادلۂ خیالات کئے تھے اور سرور جہاں آبادی، چکبست اور ڈاکٹر اقبال کی شاعری پر مفصل گفتگو بھی اسی روز جگر صاحب سے کی تھی۔ ناشاد صاحب حضرت جگر بریلوی کے شاگرد تھے اور ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے ملک میں معروف و مقبول تھے اور اردو کی کلاسیکل شاعری کی آبرو ان سے قائم تھی۔ برادرم ڈاکٹر لطیف حسین ادیب بریلوی کے خط سے معلوم ہوا کہ ناشاد صاحب کا چراغ زندگی ۵ ردسمبر ۱۹۷۰ء کی شام کو کانپور میں گل ہوگیا۔ ۱۹ ر نومبر ۱۹۷۰ء کو میرے پاس سو رگیہ ناشاد صاحب کا خط آیا تھا اور اس میں انھوں نے لکھا تھا۔

"میری تندرستی روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے داہنی آنکھ میں موتیابند شروع ہو گیا ہے اور امراض بھی گھیرے رہتے ہیں زندگی سے عاجز ہوں موت اختیاری نہیں مجبوری ہے"!

میں نے دسمبر کے آخری ہفتے میں کانپور جانے کا پروگرام بنا لیا تھا اور ناشاد صاحب کو لکھا تھا کہ دسمبر کے آخری ہفتے میں ضرور کانپور آؤں گا۔ افسوس میری یہ تمنا پوری نہ ہو سکی اور دلی آرزو دل ہی میں رہ گئی اور ناشاد صاحب اس پاپی سنسار کو چھوڑ کر چلے گئے۔ میر نے یہ شعر ناشاد صاحب جیسی ہستی کے بارے میں کہا ہوگا ؎

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دئے
پیدا کئے تھے چرخ نے جو خاک چھان کے (میر)

ناشاد صاحب اردو فارسی اور انگریزی کے عالم تھے ہندی زبان پر بھی ماہرانہ قدرت رکھتے تھے۔ آپ کی غزلیات کے دو مجموعے "کیف سرمدی" اور "سرود سرمدی" شائع ہو کر اہل ذوق و ادب سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں "کیف سرمدی" ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا اس مجموعہ کے ابتدا میں پروفیسر ضیاء احمد، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور حضرت جگر بریلوی نے مختلف انداز سے ان کے کلام پر روشنی ڈالی ہے دوسرا مجموعہ غزلیات "سرود سرمدی" ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا اور اترپردیش سرکار نے پانسو روپیہ کا انعام بھی اس غزل کے مجموعہ پر ناشاد صاحب کو عطا فرمایا تھا۔ ناشاد صاحب کی ادبی خدمات کے سلسلے میں ڈاکٹر ادیب بریلوی کی کتاب "ناشاد کانپوری حیات اور شاعری" اسی ماہ میں منظر عام پر آرہی ہے۔ افسوس ناشاد صاحب اس کتاب کا مطالعہ اپنی زندگی میں نہیں کر سکے اور ان کو پیام اجل آ گیا۔

ناشاد صاحب نے اردو کے بہت سے شعرا اور ادیبوں کی مالی امداد کی تھی لیکن کسی کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ جس زمانہ میں حضرت جگر مراد آبادی کا انتقال گونڈہ میں ہوا تھا ناشاد صاحب اس وقت گونڈہ ہی میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور انھوں نے ہر ممکن طریقہ سے جگر صاحب کی صحت کا خیال رکھا اور ان کی خدمت میں برابر

عبد المتین نیاز

غزل

زندگی جب رنگ سے سپنوں کے خالی ہو گئی
خود ہماری ذات ہم سے ہی سوالی ہو گئی

آؤ ہم ڈھونڈیں خلا میں چل کے اک دنیا نئی
اب تو یہ چہروں کی دنیا دیکھی بھالی ہو گئی

وقت کے دامن پہ آنکھوں نے کھلائے پھر گلاب
جب لہو سے پُر ہمارے دل کی پیالی ہو گئی

کل نمائندہ تھا میں تہذیب کا سب کے لئے
آج میری بات بھی یاروں کو گالی ہو گئی

آج تو میں نے نہ پہچانا اسے بھی دیر تک
آشکار اس پر مری آشفتہ حالی ہو گئی

تیشۂ افکار سے ہم نے تراشا اس طرح
بدنما الفاظ کی صورت نرالی ہو گئی

تم کس کی یاد لے کر کیوں بیٹھتے ہو نیاز
پچھلی صدیوں کی حقیقت اب خیالی ہو گئی

حاضر ہوتے رہے۔ ناشاد صاحب کو اپنے استاد حضرت جگر بریلوی سے بڑی عقیدت تھی اور جگر صاحب کا ذکر بڑے احترام سے کرتے تھے اور کہتے تھے کہ جس زبان میں حضرت جگر بریلوی جیسے رشی شاعر مفکر اور ادیب موجود ہوں اس زبان کی ترقی کو کون روک سکتا ہے۔ جگر بریلوی کی شاہکار مثنوی "پیام ساوتری" اور مجموعہ رباعیات "رس" کو آپ نے ہی کوشش کر کے شائع کرایا تھا۔ ہندو شعرا اور ادیبوں پر میرے مضامین پانچ جلدوں میں شائع کرانے کی جلد ہی کوشش کر رہے تھے لیکن اب یہ میری آرزو پوری ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی۔

اب ناشاد صاحب کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے،

موت کیا ہے نغمۂ خاموش ہے
زیست کیا ہے دکھ بھری آواز ہے
موت کیا ہے آپ ہی کھل جائے گا
پہلے سمجھو زندگی کیا راز ہے

ہر ہر نفس پیام محبت ہے ہم نشیں
یہ زندگی نہیں ہے عبادت ہے ہم نشیں
دردِ جگر کسی کی عنایت ہے ہم نشیں
ہستی بھی ایک بار امانت ہے ہم نشیں

پریم کہانی کون سنائے
درد کی دولت کون لٹائے

بیل محبت کی جب بوئی
پھول ہنسے اور شبنم روئی

کٹ ہی جائے گی کسی کی یاد میں
زندگی کیا چار دن کی زندگی

موج زن ہے اس طرح دل میں امید
جیسے پھولوں سے گزرتی ہو صبا

فضا بدلے، ہوا بدلے، مکاں بدلے، زماں بدلے
ذرا تم مسکرا تو دو کہ رنگ آسماں بدلے

میں ہی تصویر رنج و یاس نہیں
کون ہے جو یہاں اداس نہیں

نظر آتا ہے اس کا جلوہ سا
یا ہے یہ بھی نظر کا دھوکا سا

سلامت ہے ہمارا آشیاں کیا
چمن سے اب نہیں اٹھتا دھواں کیا

دل میں ہر دم دھواں سا اٹھتا ہے
آگ ایسی لگی بجھا نہ سکے

باقی صفحہ ۸ سے آگے

جنھوں نے کم از کم تین مرتبہ اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ غالب کی تحریریں سب سے زیادہ انھوں نے دیکھی اور برتی ہیں، یہ عرض کرنے کی غالباً ضرورت نہیں کہ اس سے پہلے بھی بعض اوقات ان صاحب کو "ۃ" کے اوپر کے دو نقطے مختصر "ھ" کی صورت میں نظر آچکے ہیں اور اکثر نقطے ان کی نظروں میں پھیل کر جیسے بن گئے ہیں۔

بعض دوستوں کا کہنا ہے کہ سنہ ۱۲۳۸ء ۱۲۴۱ھ ۱۲۴۳ھ ۱۲۴۴ھ اور ۱۲۴۶ھ میں سے کسی نہ کسی سال ۱۴ رجب کو سہ شنبہ کا دن ضرور رہا ہوگا اس لئے مجھے چاہئے کہ میں ان سے کسی سال میں مخطوطے کا لکھا جانا تسلیم کر لوں۔ میں اپنے پچھلے مراسلوں میں ایک سے زائد بار یہ عرض کر چکا ہوں کہ میرے نزدیک (۱) یہ مخطوطہ بخط غالب نہیں ہے۔ (۲) اس کے ۱۲۶۰ھ سے پہلے لکھے جانے کا کوئی امکان نہیں اس لئے میں اس بحث کو غیر ضروری سمجھتا ہوں۔

علی گڑھ۔ • محمد انصار اللہ

صفحہ ۹ سے آگے

راہِ طلب میں تیری ملے اور پھر مٹے
اتنا تو حوصلہ ہے دلِ بیقرار کا

جب میکشوں کے ہاتھ میں جام طہور تھا
شاغل بھی تو شریک انھیں میں حضور تھا

غم کو دل سے ہے دل کو غم سے ربط
جس طرح ہے وفا کو ہم سے ربط

شاغل صاحب شاعرانہ شخصیت کے ساتھ ساتھ ادبیانہ عظمت اور تخلیقی حیثیت سے بھی متعارف تھے۔ انھوں نے جس انداز سے اردو دوست احباب کو اردو کے مطالبات تسلیم کرانے کے لئے صف بصف لا کھڑا کیا یہ انھیں کا حصہ اور کارنامہ تھا۔

• نامہ نگار

مراسلات

دیوان غالب کی بحث سے متعلق

نودریافت نسخۂ دیوان غالب سے بحث کرتے ہوئے میرے کرم فرما پروفیسر گیان چند نے فرمایا تھا کہ:

"غالب اپنے کلام میں باربار اصلاح کیا کرتے تھے۔ ایک متن کو کاٹ کر دوسرا متن لکھ دیتے تھے اور اس کے کچھ عرصے کے بعد پہلے متن پر واپس آجاتے تھے۔"
(ہماری زبان ۸ ردسمبر ۱۹۷۰ء)

اس دعوے کے لئے موصوف نے دیوان غالب کے مختلف نسخوں کے اختلافات کو پیش کیا ہے۔ بظاہر یہ بات وہ ہے جس کی صحت تسلیم کر لینے کو جی چاہتا ہے لیکن اس قسم کا فیصلہ کرتے وقت ہمیں اپنے ماخذ پر بھی نظر کرنی مناسب ہے۔ نسخۂ حمیدیہ (پہلا بھوپالی نسخہ) اور نسخۂ شیرانی دونوں کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ ان پر مندرج اصلاحیں بخط غالب ہیں لیکن دونوں کے متعلق یہ نہیں کہا گیا کہ ان کا متن بخط غالب ہے۔ اصلاحوں کے بخط غالب ہونے کے لئے کوئی قطعی شہادت موجود نہیں ہے البتہ اصلاحوں کی نوعیت پر یہ قیاس کیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تاوقتیکہ ان اصلاحوں کے بخط غالب ہونے کا کوئی قطعی ثبوت نہ مل جائے ان پر انحصار کرنا بہت صحیح نہیں ہوگا۔ دونوں نسخوں کا متن کسی کاتب نے تیار کیا ہے۔ اگر اصلاحیں بخط غالب نہیں ہیں تو ہرگز کوئی ثبوت اس بات کا نہیں کہ یہ نسخے غالب کی نظر سے گزرے تھے۔ چنانچہ یہ خیال کہ جو متن نسخۂ شیرانی میں ہے وہ یقینی طور پر نسخۂ حمیدیہ کے بعد کا ہے لازماً صحیح نہیں ہوگا بخوبی ممکن ہے کہ نسخۂ شیرانی کے کاتب کو قدیم تر مسودہ دستیاب ہوا ہو۔ اسی طرح اشعار کے حذف کا معاملہ بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی خاص شعر اس نسخے کے کاتب کو دستیاب نہ ہوا ہو یا اس نے اپنی ذاتی پسند کو دخل دیتے ہوئے کسی خاص شعر کو حذف کر دیا ہو۔ اصلاحوں کی بحث میں یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ ان کا زمانہ قطعی طور پر نامعلوم ہے دوران کتابت سے ایک مدت بعد تک کسی بھی زمانے میں یہ وجود میں آئی ہوں گی بالیقین کے ساتھ ایک کو قدیم اور دوسرے کو بعد کی نہیں کہا جا سکتا۔

حمیدہ سلطان صاحبہ نے اپنا ذ محترم قاضی عبدالودود صاحب سے جو بیان منسوب کر کے شائع کیا ہے اس کا ضروری اقتباس یہ ہے:-

"گلشن ہمیشہ بہار ایک مجہول الاقوال مولف کی غیر معروف تصنیف ہے۔ اس میں اسد کے دو مخمس اس طرح درج ہیں گویا یہ دو مختلف شاعروں کے ہیں۔۔۔۔ کسی تذکرے میں گلشن ہمیشہ بہار کے سوا غزل مذکور نہیں ملتی۔۔۔۔۔۔ یہ غزل جہاں تک لہجے کا تعلق ہے بے شک غالب کی غزل تسلیم کی جا سکتی ہے۔"
(ہماری زبان یکم نومبر ۱۹۷۰ء)

اس عبارت میں چند در چند امور غور طلب ہیں۔

۱۔ میرے نزدیک کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی "مجہول الاقوال" ہو دیا نہیں ہو سکتا کہ اس نے کبھی کوئی صحیح بات کہی ہی نہ ہو اور تاوقتیکہ کسی بات کو جھوٹ ثابت نہ کر دیا جائے محض اس بنا پر کہ اس شخص کے یہاں بیان کی کوئی اور غلطی بھی ملتی ہے' اسے بھی جھوٹ تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ پھر خوشگی نے جس طرح غالب کا ذکر کیا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ غالب کا نہایت عقیدتمند بھی تھا۔

۲۔ کسی تصنیف کا غیر معروف ہونا اس کے نامعتبر ہونے کی دلیل نہیں کتنی ہی تصانیف محققین نے ایسی پیش کی ہیں جن کے وجود ہی سے اکثر انکار کیا گیا تھا لیکن اس بنا پر کبھی نہیں کہا گیا کہ ایسی تصانیف نامعتبر ہیں۔

۳۔ گلشن ہمیشہ بہار مطبوعہ ۱۹۶۷ء میں وہ کیا ایک مخمس بھی اسد کے نام سے تحریر نہیں ہے مجھے یقین ہے کہ یہ بات استاذ محترم نے اگر لکھی ہوگی تو تذکرہ ضرور دیکھ لیا ہوگا۔

۴۔ کسی غزل، شعر یا واقعہ کا صرف ایک تذکرے میں مذکور ہونا اس کے غلط اور بے بنیاد ہونے کی دلیل ہرگز نہیں، کبھی کبھی محض ایک ہی راوی کی شہادت نہایت معتبر تسلیم کی جاتی ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ خوشگی نے شیفتہ کے تذکرے کے جواب میں اپنا تذکرہ لکھا تھا اگر اس نے یہ غلطی کی ہوتی تو شیفتہ کے طرفدار بھی اسے مطعون کر سکتے تھے۔

۵۔ محض لہجے کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرنا مناسب نہیں ہے۔ عرشی صاحب نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے:

"رنگ کلام کو شہادت میں پیش کرنا بیحد خطرناک ہے اس لئے میں اس کلام کو غالب کے یقینی کلام کا درجہ اس وقت تک نہیں دے سکتا جب تک کوئی مستند شہادت سامنے نہ آجائے۔" (نسخۂ عرشی)

اس بارے میں آسی مرحوم کی پیش کردہ بیاضوں والی تعنیہ کو ذہن میں رکھنا مفید تر ہوگا جن کی رنگ کلام کی بنیاد پر نیاز فتحپوری مرحوم اور جناب مجنوں گورکھپوری جیسے باکمال صاحب نظر ناقدین تصدیق کر چکے تھے۔

"باغ خیر" کی شہادت بھی اس سلسلے میں اہم ہے اس میں مخمسے پر شاعر کا نام نہیں لکھا ہے بلکہ صرف "غزل اسد" لکھا ہے۔ "باغ خیر" اس زمانے میں تالیف ہوئی جب مرزا اسداللہ خاں اپنے دوسرے تخلص یعنی غالب کے ساتھ زیادہ مشہور ہو چکے تھے قدیم تر تخلص یعنی اسد محض ایک تاریخی یادگار کی حیثیت سے

باقی رہ گیا تھا۔ اس دور کے تذکرہ نویس ان کے نام کے ساتھ جب تک بھی تخلص لکھتے تھے تو جدید تخلص بھی انھیں اسد تخلص کے دوسرے شعرا سے ممتاز کرنے کے لیے عموماً لکھتے تھے (ملاحظہ ہو تذکرہ نادر، چمن بے نظیر وغیرہ) اس کے علاوہ "باغ جہر" کے مولف سے عام طور پر یہ متوقع ہے کہ وہ اگر مرزا کا ذکر کرتا تو احتراماً ایک دو کلمہ ان کے نام کے ساتھ خواہ وہ ان کے خطاب ہی ہوتے لکھتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا ایسا کرنا اس کے لئے ممکن بھی نہ تھا کیونکہ یہ غزل اسد مرحوم کی تھی جس سے مولف باغ جہر کو کوئی عقیدت ہونی ضروری نہ تھی اور جس کا دوسرا تخلص بھی نہ تھا۔

نثار احمد فاروقی صاحب نے نودریافت نسخہ دیوان غالب کے سلسلے میں نسبتاً زیادہ معلومات بہم پہنچائی ہیں، انھوں نے بعض ایسی اطلاعات بھی دی ہیں جن کا ذکر شاید مصلحت اندیشوں کے نزدیک نامناسب تھا ظاہر ہے فاروقی صاحب کا یہ طریقہ کار قابل قدر ہے ایک موقع پر موصوف نے لکھا ہے:

"ہر صفحے پر اوسطاً ۲ کالم ہیں اور ہر کالم میں تقریباً ۹ سطریں ہیں لیکن تمام نسخے میں کالم یا سطروں کی کوئی پابندی نہیں ہے ...... بعض صفحوں پر غالب نے مکتوبی سطروں سے مربع یا مثمن شکل بنا دی ہے کچھ اوراق کا سائز بڑا ہے اور ان کے کنارے موڑے ہوئے ہیں۔ ان مڑے ہوئے کناروں پر کسی دوسرے خط سے نئی غزلیں اضافہ کی گئی ہیں۔"

(تلاش غالب ص۲۹۱)

افسوس ہے کہ اب مخطوطہ کا پتا نہیں چلتا ہے (مسٹر ایس جی سمنانی نے ایک صاحب کی تحویل میں اس مخطوطے کے محفوظ ہونے کا ذکر کیا ہے لیکن ابھی کسی دوسرے ذریعہ سے اس کی تصدیق نہیں ہو سکی ہے۔ ملاحظہ ہو ہندوستان ٹائمز مورخہ ۲۱ مارچ ۱۹۸۱ء) اس لئے درج ذیل امور کی توثیق یا توضیح کے لئے بجز چشم دید شاہدوں کے بیان کے کوئی ذریعہ نہیں ہے یعنی:

۱۔ ایسے بڑے سائز کے اوراق کی کل تعداد کیا تھی؟

۲۔ کیا ہر بڑے ورق پر نئی غزل کا اضافہ کیا گیا ہے؟

۳۔ کیا ایسا اضافہ عام سائز کے کسی ورق پر بھی ملتا ہے؟

۴۔ مکتوبی سطروں سے مربع یا مثمن شکل ان دونوں میں سے کسی ایک سائز کے اوراق پر بنائی گئی ہے یا دونوں سائز کے ورقوں پر یہ صورت ملتی ہے؟

۵۔ صفحے کے خاتمہ پر "ترک" کا التزام دونوں میں سے کس سائز کے اوراق پر ہے؟ ہے بھی یا نہیں؟

یہ امور اگر قطعی طور پر معلوم ہو سکیں تو مخطوطہ سے متعلق غور و فکر کے لئے کچھ نئی راہیں شاید کھل جائیں

فاروقی صاحب نے مخطوطہ کا تعارف کراتے ہوئے ایک اور قابل لحاظ بات کہی ہے:

"ورق ۹۳ الف پر یہ نسخہ تمام ہو جاتا ہے۔ اگلے ورق پر کسی نے یوں ہی خامہ فرسائی کی ہے۔ ایک آدھ لفظ یا مصرعہ یا شعر لکھا ہے جیسے قلم کا امتحان کرنے کو لکھتے ہیں لیکن اس کا غالب سے کچھ تعلق نہیں نہ یہ ان کا خط ہے۔" (تلاش غالب ص۲۰۳)

مخطوطے کے آخری صفحہ پر اگر محض قلم کا امتحان کرنے کے لئے ہی یہ خامہ فرسائی کی گئی ہے تو اس کا سبب غالباً یہ ہوگا کہ کاتب اس قلم سے ابھی کچھ اور لکھنا چاہتا تھا، اس مخطوطہ کے ساتھ "قصہ لیلیٰ مجنوں" کا مخطوطہ منسلک بتایا گیا ہے کیا اس کا امکان ہے کہ اس قصہ کے کاتب نے ہی یہ خامہ فرسائی کی ہو؟ دونوں کے سواد خط، روشنائی، قلم کے قط وغیرہ پر غور کیا جائے تو شاید کوئی مفید مطلب بات سامنے آ سکے۔

کسی مخطوطے کے آخر یا شروع میں اس قسم کی خامہ فرسائی عموماً یا تو اس نسخے کے کاتب سے متوقع ہوتی ہے یا نسخے کے مالکوں یا ان کے متعلقوں سے۔ اس مخطوطے پر اس خامہ فرسائی کے زمانے کے متعلق کسی نہ کسی حد تک قیاس آرائی کی جا سکتی ہے اور ممکن ہے کہ یہ اطلاع مفید ثابت ہو سکے۔ وہ خصوصیات جو اس خامہ فرسائی کو مخطوطہ کے متن کی تحریر سے ممیز کرتی ہیں ہنوز معلوم نہیں ہو سکی ہیں، یہ تفصیلات بھی ممکن ہے کہ مفید ثابت ہوں۔

کہا گیا ہے کہ کسی شخص نے بعد میں مخطوطہ کے حاشیہ پر نئی غزلوں کا اضافہ کیا ہے ہو سکتا ہے کہ اسی شخص نے یہ خامہ فرسائی بھی کی ہو اس امکان پر بھی غور کیا جانا چاہئے۔

"اردوئے معلیٰ" دہلی کے "غالب نمبر" کا "حصہ سوم" شائع ہو چکا ہے، اس میں ایک مضمون "گل رعنا بخط غالب" سے متعلق بھی ہے، اس کا ایک اقتباس یہ ہے:

"(غالب نے ناظم کو) اصلاح دیتے ہوئے لکھا۔ 'یہاں ایک کی جگہ اک بے یائے تحتانی درست ہے مگر ہر کے ساتھ مرکب ہو نہ ہر اک نہ۔ ایسے موقع پر انھوں نے اس لفظ کی مخصوص شکل اختیار کی تھی یعنی وہ ے کا شوشہ بناتے ہیں مگر اس کے نیچے نقطے نہیں لگاتے ہیں یہی صورت زیر بحث نسخے (گل رعنا) میں بھی پائی جاتی ہے ملاحظہ ہو عکس نمبر ۱ شعر نمبر ۱۔"

(ص ۲۸۳)

میں نے اس عکس نمبر ۱ کے شعر نمبر ۱ کو بغور دیکھا، اور چاہتا ہوں کہ جن حضرات کو موضوع سے دلچسپی ہے وہ بھی اسے ملاحظہ فرما لیں اس میں ایک اک کی "ے" کے نیچے دو نقطے نہایت واضح طور پر بنے ہیں۔ مشاہدہ یا بیان کا یہ فرق ان صاحب کے بیان سے

(باقی صفحہ ۷ پر)

انجمن کی خبریں

شری کے۔ آر۔ دھیر کے اعزاز میں ادبی نشست

امرتسر: انجمن ترقی اردو امرتسر کے سرپرست شری کے۔ آر دھیر کسٹمز کلکٹر امپورٹ ایکسپورٹ یہاں سے تبدیل ہو کر دہلی تشریف لے جا رہے ہیں ان کے اعزاز میں انجمن ہذا کے زیر اہتمام دفتر ماہنامہ "جاں نثار" میں اردو کی ادبی نشست ہوئی۔ راج کوی جناب میلا رام وفا نے صدارت فرمائی۔

محفل شعر و سخن کے بعد جناب دھیر صاحب کی انجمن کے لئے خدمات کا جناب صابر ابوہری پریذیڈنٹ انجمن نے پرزور الفاظ میں اعتراف کیا۔ جناب دھیر صاحب نے جوابی تقریر میں اس خلوص و محبت کے لئے اراکین انجمن کا شکریہ ادا کیا۔

• نامہ نگار

انجمن ترقی اردو شاخ کریم نگر کا خصوصی اجلاس

کریم نگر: انجمن ترقی اردو شاخ کریم نگر کی کارکردگی کو موثر بنانے کے لئے مکند لال مصرا ایڈوکیٹ و صدر انجمن ترقی اردو ہذا کے زیر صدارت ایک خصوصی اجلاس منعقد کیا گیا۔ جناب سرینواس لاہوٹی معتمد تنظیمی مرکزی انجمن مہمان خصوصی تھے۔ اس جلسے میں طے کیا گیا کہ ہشتم، نہم اور دہم کے اردو جماعتوں کی برقراری کے لئے طلبہ اور سرپرستوں سے ربط پیدا کیا جا کر ان مدارس میں داخلے لینے کی خواہش کی جائے جہاں اب اردو جماعتیں ختم ہو رہی ہیں جونیر کالج میں اردو متوازی جماعتوں کے قیام کے لئے موثر نمائندگی کی جائے تاکہ حکومت بروقت اس کا اعلان کر دے کالج میں شرکت کے لئے سائنس کے مضمون میں ۵۰ فیصد نشانات پر اصرار بے معنی ہے اس لئے اس شرط کو اٹھا دیا جائے۔ ماہ جون کے دوسرے ہفتے میں انجمن ہذا کا ایک سالانہ جلسہ منعقد کیا جائے اس مقصد کے لئے ایک سات رکنی ذیلی کمیٹی تشکیل دی گئی ہے۔

• نامہ نگار

رام گنڈم میں انجمن ترقی اردو کا جلسہ

رام گنڈم: انجمن ترقی اردو شاخ رام گنڈم کی جانب سے جناب سرینواس لاہوٹی معتمد تنظیمی انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے اعزاز میں ایک خیر مقدمی جلسہ منعقد ہوا جناب محمد محمود علی صدر انجمن مقامی نے جلسہ کی صدارت کی۔ متعدد مقررین نے لاہوٹی صاحب کی خدمات کو سراہا۔

مرزا الیسین بیگ، جناب سردار خان اور جناب الیس راٹھو سندری پنڈت نے اردو کی اہمیت اور رام گنڈم میں انجمن ترقی اردو کی مساعی پر روشنی ڈالی۔ جناب یعقوب علی جنرل سکریٹری نے رام گنڈم میں اردو جماعتوں کے قیام کے سلسلہ میں عائد کردہ شرائط پر تنقید کی۔ انھوں نے جناب لاہوٹی سے اس ضمن میں نمائندگی کرنے کی اپیل کی۔ جناب لاہوٹی نے اردو داں اصحاب کی ذمہ داریوں پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ زبان کے مسئلہ کو ملازمت یا معیشت سے وابستہ کرنا دانشمندی نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو دوستوں کی عدم دلچسپی اور تساہل ہی سے اردو زبان کو خدشہ ہے۔

• نامہ نگار

حضرت شاغل مرحوم کو خراج عقیدت

(نوٹ: صاحبزادہ شوکت علی خاں صاحب نے مولانا احترام الدین احمد شاغل جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو راجستھان کی وفات سے متاثر ہو کر ایک ادبی اجتماع میں ایک مقالہ پڑھا جس میں مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا گیا تھا اس کا انتخاب ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

ادارہ)

حضرت شاغل کے انتقال سے محفل ادب ویران ہو گئی۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ ان میں تہذیب و تمدن کا رچاؤ تھا۔ وہ محفل کی رونق بھی تھے اور بزم کی زینت بھی۔ یہ وہی شاغل اردو نواز تھے جو تسلیم منزل[1] کے گوشۂ عافیت میں بیٹھے بیٹھے خاموشی سے زبان و ادب کی خدمت کرتے رہے تسلیم منزل خود اپنی جگہ ایک اکیڈمی ہے جو نامور ٹونکی خاندان کی عظمت پارینہ اور حشمت رفتہ کی زندہ نشانی ہے جس کے بیش بہا مخطوطات میں اب بھی احتشام و شوکت کی شان و عظمت کے قصے ملیں گے۔

مجھے ۱۹۵۶ء کا وہ مبارک و مسعود وقت یاد ہے جب حضرت شاغل نے جانفشانی اور سعی بلیغ کے ساتھ اردو کنونشن بلایا تھا۔ یہ کنونشن اردو کے خواب پریشاں کی ایک شگفتہ تعبیر روشن مستقبل کی دلیل اور اردو کے جشن اردو کا افتتاح تھا یہی آغاز بھی تھا اور انجام بھی اور ایک مسلسل جد و جہد اور تعمیر ادب کا ضامن بھی۔

شاغل مرحوم شاعر بھی تھے۔ ان کے اشعار میں زمانے کا غم افتاد نازکی صورت میں تاثر خیز کیفیت لئے ہوئے ہے۔ یہاں چند اشعار نمونۂ کلام کی حیثیت سے پیش ہیں۔

(باقی صفحہ ۶ پر)

---

[1] تسلیم منزل مرحوم کے دولت خانے کا نام ہے۔ اسی میں انجمن ترقی اردو کا دفتر ہے۔

اخبار و اذکار

علامہ علی اختر تلہری کی وفات پر تعزیتی جلسہ

گورکھپور: شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی کے طلبہ و اساتذہ کا ایک تعزیتی جلسہ زیر صدارت ڈاکٹر محمود الٰہی، صدر شعبہ منعقد ہوا۔ جس میں علامہ علی اختر تلہری کے انتقال پر ملال پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے صدر جلسہ نے کہا کہ علامہ علی اختر تلہری تنقید و تحقیق کی مشرقی روایات کے علمبردار تھے۔ ان کی موت اردو ادب کے لئے ایک سانحۂ عظیم ہے۔ ڈاکٹر اختر نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم کے قلم سے نکلے ہوئے مضامین اردو ادب کا ایک گراں قدر سرمایہ ہے۔

آخر میں حسب ذیل تعزیتی تجویز کے بعد جلسہ اختتام پذیر ہوا۔ شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی کا یہ جلسہ علامہ علی اختر تلہری کے انتقال پر رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ خدا مرحوم کو جنت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• سید فضل امام رضوی

راجوری میں شام غزل

بزم ادب راجوری کے زیر اہتمام ٹاون ہال میں زیر صدارت جناب نذیر فراز ایک طرحی مشاعرہ ہوا۔ مصرعہ طرح

"یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا" تھا۔ ممتاز

و نامور شعرائے کرام نے اپنا کلام سنایا۔

اس کے بعد غیر طرحی دور چلا۔ اختتام سے قبل شہباز راجوری کی تحریک پر بزم نے ذیل کی دو قراردادیں باتفاق رائے منظور کیں۔

(۱) "بزم ادب راجوری" کا یہ اجلاس محسوس کرتا ہے کہ اردو رسم الخط کی تبدیلی کی آواز جو وقتاً فوقتاً اٹھائی جاتی ہے یہ محض اردو دشمنی ہے۔ اور اس طرح بغیر کسی ظاہری کوشش کے اردو کے قتل کا سامان ہے کیونکہ اردو اور ہندی میں قریبی مماثلت ہے، صرف اسما کے استثناءات جو فارسی اور عربی کے رہ جائیں گے یہ زبان باسانی دیوناگری رسم خط اختیار کرتے ہی ختم ہو جائے گی۔ اس لئے اردو کی ترقی کے نام پر اس قسم کے شوشہ بازوں سے اسے تحفظ دلانا ہے یہ اجلاس حکومت ہند سے مطالبہ کرتا ہے کہ اس قسم کی تمام سازشوں کو غیر قانونی قرار دیا جائے اور اس کے موجودہ رسم الخط کا تحفظ کیا جائے۔

(۲) بزم ادب راجوری ماہ اپریل کی نشست کو بطور اقبال ڈے منائے گی جس کے لئے شایان شان انتظامات کئے جائیں۔

(۳) "اردو گھر" فنڈ کے لئے بزم کی طرف سے اعانتی رقم جمع کی جائے اور تعمیر کے لئے بھیجی جائے۔

• شہباز راجوری، صدر بزم ادب

جناب بسمل سعیدی کے چوتھے مجموعہ کلام "اوراق زندگی" کا خیر مقدم

ٹونک: ہند و پاک کے مایۂ ناز و قادر الکلام شاعر جناب بسمل سعیدی کا چوتھا مجموعہ کلام "اوراق زندگی" کے شائع ہونے پر ٹونک میں بھی ایک تقریب مسرت منعقد ہوئی اور ڈپٹی کمشنر دہلی جناب اروڑا اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا شکریہ ادا کیا کہ ان گرامی قدر ادب دوست حضرات نے "اوراق زندگی" کے اجراء کی تقریب کے مراسم دہلی میں ادا کئے۔

اس سلسلے میں ۲۵ر اپریل کو شفا منزل ٹونک میں ٹونک کے چند ادبا اور شعراء نے جمع ہو کر "اوراق زندگی" کی اشاعت پر اپنے جذبات مسرت کا اظہار کیا ہے اور جناب بسمل سعیدی کو اور ان کی ادبی و شعری خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اوراق زندگی کی خریداری کی جانب اہل ٹونک کو توجہ دلائی۔

سکریٹری

جناب کامل چاندپوری کے اعزاز میں نشستیں

۲۶ر اور ۲۷ر اپریل ۱۹۷۱ء کو "شفا منزل" ٹونک میں ایک مختصر شعری نشست جناب کامل چاندپوری کے اعزاز میں منعقد ہوئی۔ مشاعرہ میں جناب کامل چاندپوری کے علاوہ ٹونک کے منتخب شعراء نے اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ فرمایا۔ شہر کے ادبی اور شعری حلقوں میں آپ کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ اور آپ کے اعزاز میں متعدد مشاعرے اور شعری نشستیں منعقد ہوئیں۔

• سکریٹری

تبصرہ

محمد انصار اللہ

بمبئی میں اردو (۱۹۱۸ء تک)

از: ڈاکٹر میمونہ دلوی
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، دہلی
قیمت: بارہ روپے پچاس پیسے

کتاب کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ بمبئی کی سیاسی و سماجی تاریخ　۲۔ تذکرہ شعراء و نثر نگار
۳۔ صحافت　۴۔ علمی و ادبی تحریکیں
۵۔ اردو ڈرامہ　اور　۶۔ لوک گیت

اس طرح بمبئی میں اردو کے آغاز و ارتقا کی تقریباً ساری بحثوں پر کتاب حاوی ہے۔ "پیش لفظ" میں کہا گیا ہے:

"اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جس زمانے میں مذکورہ صوبوں اور شہروں میں اردو زبان و ادب اپنی ارتقائی منزلیں طے کر رہے تھے اس زمانے میں بمبئی میں بھی اس زبان و ادب کے لئے کام ہوتا رہا ہے۔"

بمبئی میں ہندوستانی اور عرب تہذیب و زبان کے اختلاط اور ارتباط کے مواقع بہت پہلے سے تھے اور پھر فاضل مصنفہ کے جملۂ مذکور کو پڑھ کر خیال ہوا تھا کہ کتاب میں اردو زبان و ادب کے بعض ایسے نادر اور قدیم نمونے بھی پیش کئے گئے ہوں گے جو لسانی اور تاریخی اہمیت کے حامل ہوں لیکن تذکرہ اول کے شعرا میں پہلا نام تیرھویں صدی ہجری کے ایک بزرگ کا دیکھ کر حیرت ہوئی۔ کتاب کے چند اوراق اور پڑھنے کے بعد یہ احساس تقویت پکڑتا گیا کہ تلاش و تحقیق واقعات میں بھی کما حقہ، کاوش نہیں کی گئی۔ مثال کے طور پر رز اکت کے حال میں "نسیم سخن" سے صرف ایک جملہ اور ایک شعر نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے حالانکہ درگا پرشاد نادر کے تذکرے "چمن انداز" میں اسی غزل کے نو شعر لکھے ہوئے ہیں اور فصیح الدین رنج نے بھی "بہارستان ناز" میں چھ شعر نقل کئے ہیں، یہ دونوں تذکرے مطبوعہ ہیں۔ رز اکت کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ "مقیم بمبئی" تھے۔ اگر ایسے سب شاعروں کا ذکر کیا جائے جو "مقیم بمبئی" رہے ہیں تو ان کی تعداد اچھی خاصی ہو جائے گی کم از کم دو نام سر دست میرے ذہن میں ہیں اول امین الدولہ آغا علی خاں مہر ثانیاً ان کے استاد میر علی اوسط رشک تلمیذ ناسخ، یہ دونوں عراق جاتے ہوئے بمبئی رکے تھے، بمبئی کے زمانۂ قیام میں انھوں نے بمبئی کی سیر و تفریح اور دعوتوں وغیرہ سے متعلق متعدد قطعات تاریخ کہے جو ان کے دیوان میں موجود ہیں، قدیم تذکروں کی ورق گردانی کی جائے تو بمبئی کے شعرا کی فہرست میں قابل ذکر حد تک اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

"کتابیات" میں مطبوعات ہی نہیں مخطوطات تک کے متعلق تفصیلات قلمبند نہیں کی گئی ہیں، کسی مخطوطہ کے بارے میں کم از کم اتنی بات تو معلوم ہونی ہی چاہئے کہ یہ کس زمانے کا ہے اور کہاں ہے ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ کتاب میں چند مقامات پر عتیق احمد صدیقی صاحب کا حوالہ دیکھ کر تعجب ہوا بعد میں کتابیات سے معلوم ہوا کہ یہ سہو قلم ہے مصنفہ کی مراد دراصل محمد عتیق صدیقی صاحب سے تھی۔

"پیش لفظ" میں کہا گیا ہے کہ "بمبئی کی اردو خدمات کے سلسلے میں یہ کتاب نقش اول کی حیثیت رکھتی ہے "چراغ سے چراغ جلتے ہیں"، توقع کی جانی چاہئے کہ اب اس موضوع پر جو کام کیا جائے گا وہ زیادہ مکمل اور جامع ہوگا اور بمبئی میں اردو کی لسانی اور ادبی تاریخ زیادہ بہتر طور پر مرتب کی جا سکے گی۔ زیر تبصرہ کتاب پر ڈاکٹر میمونہ دلوی صاحبہ کو بمبئی یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری دی ہے۔ موضوع بہرحال اہم ہے اور کام بھی محنت سے کیا گیا ہے توقع کی جانی چاہئے کہ علمی حلقوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

▲

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

میرا صفحہ

گئودان

۱۵ دسمبر ۱۹۷۰ء کے ہماری زبان میں "میرا صفحہ" کے عنوان کے تحت میں نے پریم چند کی اردو گئودان کے بارے میں بعض داخلی اور خارجی شہادتوں کی بناء پر اس بحث کو اٹھایا تھا کہ اردو گئودان، پریم چند کی تصنیف نہیں، یہ دراصل ترجمہ ہے ان کے ہندی "گئودان" کا جو اقبال ورما سحر ہتگامی نے کیا تھا اور اس لئے اس ناول کا شمار اردو کے ناولوں میں نہیں کیا جاسکتا۔

اس سلسلے میں نثار احمد فاروقی صاحب اور ویریندر پرشاد سکسینہ صاحب کے خطوط علی الترتیب یکم جنوری ۱۹۷۱ء اور ۲۲ جنوری ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئے۔ ان خطوط میں اصل مبحث ضمنی بحثوں کا شکار ہو کر رہ گیا۔ مثلاً نثار صاحب "ہتگامی" اور "ہنگامی" کے نقطوں میں الجھ کر رہ گئے۔ سکسینہ صاحب نے اس بات کی تحقیق کی کہ اقبال ورما سحر کا پورا نام "منشی اقبال ورما بہادر سحر ہتگامی تھا" گو سحر صاحب کے خود نوشت حالات سے سکسینہ صاحب نقل کرتے ہیں "پورا نام اقبال بہادر ورما سحر، مگر مختصراً اقبال ورما سحر لکھتا ہوں"۔ ظاہر ہے کہ اگر میں نے اپنے مختصر نوٹ میں سحر صاحب کا مختصر نام استعمال کیا تو اس میں کیا قصور کیا۔

لیکن ان خطوط سے دو اہم باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ نثار صاحب کا یہ خیال کہ اردو گئودان پریم چند کی تصنیف نہ ہوتے ہوئے بھی فنی خوبیوں، مثلاً کردار نگاری، پلاٹ وغیرہ کی حامل رہتی ہے؛ اور اس نقطۂ نظر سے صرف اس کے اسلوب کی اہمیت باقی نہیں رہتی، کسی طرح صحیح نہیں۔ کیا چارلز ڈکنز یا طامس ہارڈی کے ناولوں کے اردو ترجمہ کو ہم اس معیار پر جانچ سکتے ہیں۔ اور کیا ان کے ناولوں کی فنی خوبیوں کا تذکرہ اردو ناول نگاری کے سلسلے میں کیا جاسکتا ہے۔ ترجمہ بہرحال ترجمہ ہے وہ چاہے اردو سے کیا گیا ہو یا ہندی سے اور اصل تصنیف کی خوبیوں کا تذکرہ جس زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے اس کی تاریخ یا تنقید کا جزو قرار نہیں دیا جاسکتا۔

ویریندر پرشاد سکسینہ صاحب کے مراسلے سے میرے ان معروضات کی تصدیق ہوجاتی ہے جو میں نے پریم چند کے خطوط اور ان کے دوستوں کے بیانات کی بنیاد پر قائم کئے تھے۔ چونکہ سکسینہ صاحب کی دسترس سحر صاحب کے خود نوشت حالات کے مسودہ تک ہے جس سے انھوں نے اپنے خط میں اقتباسات بھی دئے ہیں، اس لئے اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ پریم چند نے اپنی ہندی ناولوں کو اردو میں منتقل کرتے وقت سحر صاحب سے مسلسل مدد لی ہے جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں:

> "منشی پریم چند آنجہانی کے متعدد قصے اور کئی ناول مثلاً رنگ بھوم، کرم بھوم، پریم آشرم، نرملا وغیرہ ہندی سے اردو میں کئے جو چھپ چکے ہیں۔ ابھی ان کا آخری ہندی ناول "گئودان" (گئودان ہونا چاہئے : مسعود) بھی جامعہ ملیہ سے شائع ہوچکا ہے جس کا اردو ترجمہ میرا ہی کیا ہوا ہے۔"

اس تحریری دعوی اور پریم چند کے جگری دوست دیانرائن نگم کی شہادت کے بعد اس بات کی کہاں گنجائش رہتی ہے کہ ہم اردو گئودان کو پریم چند کی تصنیف کہہ سکیں، بلکہ یہ لازم ہوجاتا ہے کہ دیگر ناولوں میں اقبال ورما سحر کا در پردہ جو حصہ ہے اسے بھی روشنی میں لائیں۔

چونکہ کسی زبان کے ناول کا ترجمہ جس زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے اس کی تاریخ ادب کا جزو قرار نہیں دیا جاسکتا اس لئے ہم پریم چند کی اردو گئودان کو ان کی تصنیف نہیں کہہ سکتے۔ یہ بہرحال ترجمہ ہے اور اس لئے اسے اردو کا ناول یا بہترین ناول قرار دینا حقائق سے انحراف کرنا ہے۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر و پبلیشر سید تفضل حسین ایم اے نے ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا

REGD. No. L. 922	ٹیلیفون نمبر ۲۹	R. No. 2186/57